ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد

استاد شعبہ اردو، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

معاشرے کی تعمیرِ نو میں جدید اُردو غزل کا کردار

Dr. Arshad MehmoodNashad
Associate Professor, Urdu Department,
Allama Iqbal Open University, Islamabad

Role of Modern Urdu Ghazal in Reconstruction of Society

There is a deep and perdurable bond between literature and society. Not only literature is the reflection of society but also it serves as its guiding star. This is the reason that literature has played a very active role in the development of many nations of the world. In the Eastern literature, Ghazal has this distinctive place among the literary genres. Generally, this criticism is leveled against ghazal that it is just a representation of amorous designs and fictitious narration of physical charms and it is divorced from any socio-historical context. Also it does not serve to guide the society towards some practical goal. The criticism is not justified as Ghazal has always incorporated socio-historical changes in its subject matter and has played its part in the reconstruction of society. In this article, along with highlighting the relationship between literature and society, there is also this attempt to bring the social role of ghazal to the foreground. Especially, the role played by ghazal in the reconstruction of Pakistani society after partition, is significant. The barbarism, which the Pakistani society went through during its martial law periods, has been brought to light by this genre in a very subtle way. In the article, these facts are discussed with the help of verses from different poets.

ادب اور سماج باہم لازم وملزوم ہیں۔ دونوں کا باہمی تعلق اٹوٹ بھی ہے اور ہمہ رنگ بھی۔ ادب کی تخلیق وتعبیر اور تشکیل وفروغ سماج کا مرہونِ منت ہے اور سماج کی تعمیر وترقّی اور وزن ووقار ادب کا منت گزار ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے محافظ اور صلاح کار بھی ہیں اور چارہ گر و چارہ ساز بھی۔ دونوں اپنی سمت ورفتار کی تعیین میں ایک دوسرے کے دست وبازو ہیں۔ زندگی ان دونوں میں روح کی طرح موج زن ہے اور ان میں تغیرات پیدا کرنے کا محرک بھی۔ زندگی جوئے رواں کی صورت ایک منطقے سے دوسرے منطقے میں سفر کرتی ہے۔ سیماب صفتی اس کا شعار اور بے قراری اس کا وظیفہ ہے۔ زندگی کی یہ آوارہ

خرامی اسے قدم قدم پر نئے رنگوں سے ہم کنار کرتی ہے اور گام گام اُسے کروٹیں بدلنے پر مجبور کرتی ہے۔ زندگی کی یہ نوع بہ نوع شکلیں اور رنگ بدلتی صورتیں سماج اور معاشرت کو نئے امکانات کی بشارت دے کر ان کے اندر تبدیلی پیدا کرنے کا فریضہ انجام دیتی ہیں۔ ادب چوں کہ سماج کا ترجمان اور نقیب ہے اس لیے سماج میں ہونے والی تبدیلیوں سے ادب بے نیاز نہیں رہ سکتا۔ ادب کا وظیفہ محض جمالیاتی احساس کی تسکین اور تفریح فراہم کرنا نہیں بلکہ سماجی صورتِ حال اور معاشرتی مسائل کی آئینہ داری اور چارہ گری بھی ہے اس لیے ادب حالات و واقعات کی بہتر ترسیل، زندگی کی کامل صورت گری اور اجتماعیت کی تہذیب واصلاح کے لیے ہمہ وقت تبدیلی کے لیے تیار رہتا ہے۔ سماج کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ ادب بھی تبدیل ہوتا ہے کیوں کہ مکمل معاشرتی آگہی کے بغیر ادب کا ہاتھ سماج کی نبض پر نہیں رہ سکتا اور اس کے اندر وہ تخلیقی روح بیدار نہیں ہوسکتی جو زندگی کی کروٹوں کا مفہوم سمجھتی اور سماجی اقدار کو نئے معنی عطا کرتی ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی فرماتے ہیں:

> ''عصری آگہی کے بغیر بڑا ادب تخلیق نہیں کیا جا سکتا۔ اپنے زمانے اور اس کے شعور ہی سے تخلیق کی روح بیدار ہوتی ہے لیکن یہ روح صرف زندگی کی یک رُخی ترجمانی نہیں کرتی بلکہ اس میں لاتعداد رخوں کو سمیٹ کر اسے کچھ اور بنا دیتی ہے۔ اس لیے ادب کی آواز ایک طرف اپنے دور کی اور دوسری طرف آنے والے دور کی آواز بن جاتی ہے۔ ادب اور زندگی کا یہی رشتہ ہے جو واقعات سے نہیں بلکہ روح سے قائم ہوتا ہے۔'' (۱)

جس طرح ٹھہرا ہوا پانی متعفن ہو کر بے مصرف ہو جاتا ہے اسی طرح ادب بھی اگر جمود کا شکار ہو تو اجتماعی زندگی کے لیے بے معنی ہو جائے۔ تخلیق کار معاشرے کا فعال اور حساس فرد ہوتا ہے، وہ معاشرتی تبدیلیوں اور تغیرات سے کیسے بے نیاز رہ سکتا ہے؟ انسانوں کے دُکھ درد، اقدار کی شکست وریخت، حالات و واقعات کی سفاکی، معاشرتی تخریب، احساس کی ریزگی اور ماحول کے جبر سے وہ کیسے آنکھیں چُرا سکتا ہے؟ وہ معاشرے کی آنکھ ہے جیتی جاگتی اور منظروں سے کلام کرتی آنکھ۔ وہ معاشرے کی ان تصویروں کا آئینہ بردار بھی ہے اور ان کا چارہ گر بھی۔ وہ اپنی تحریروں کے ذریعے انسانوں کو آلام ومصائب میں زندہ رہنے کا حوصلہ عطا کرتا ہے اور ان کے جذبات کی تطہیر اور احساس کی تشکیل کرنے کا فرض بھی ادا کرتا ہے۔ وہ افراد کو ان کی جبلی خواہشات سے بلند کر کے انسانیت کے اعلیٰ وارفع مقام پر فائز کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کی تخلیقات افرادِ معاشرہ کی خفتہ وخوابیدہ صلاحیتوں کو بیدار کر کے انھیں معاشرے کا فعال اور کارآمد رکن بناتی ہیں۔

ادب اور اس کی تمام اصناف معاشرتی زندگی سے مکمل طور پر جُڑی ہوتی ہیں۔ اس وابستگی اور پیوستگی کے بغیر ادب اور اس کی اصناف کی حیثیت شاخِ بُریدہ سے زیادہ نہیں رہ جاتی۔ جس طرح شاخِ بُریدہ لذتِ نمو سے محروم ہو جاتی ہے اسی طرح اجتماعی احساس سے کٹ کر ادب اور اس کی اصناف کا تخلیقی وفور ماند پڑ جاتا ہے۔ ادب اور اس کی اصناف کا زندگی سے رشتہ ہی اس کے ہونے کی دلیل ہے اور اس کی تخلیق کا جواز۔ شمس الرحمٰن فاروقی لکھتے ہیں:

> ''زندگی سے قرب وبُعد کا سوال تو اس وقت پیدا ہوتا ہے جب ادب ہماری زندگی سے روشناسی میں کوئی

اضافہ نہ کرے یا زندگی کے کسی بھی پہلو کا شدید احساس پیدا نہ کرے۔ جب تک ادب اس عمل میں کامیاب ہے، ادب ہے چاہے زندگی اس میں چھن کر، نکھر کر بظاہر کتنی تھوڑی سی کیوں نہ رہ جائے۔ (۲)

غزل کو مشرقی ادبیات میں گلِ سرسبد کی حیثیت حاصل ہے۔ فارسی اور اُردو کے شعری سرمائے میں غزل کا حصّہ کمیت اور کیفیت کے اعتبار سے دوسری شعری اصناف پر فضلیت اور تقدم رکھتا ہے۔ تاثیر اور اثر پذیری کے لحاظ سے بھی غزل دوسری اصناف پر سبقت رکھتی ہے۔ اس کے اشعار قلب و نگاہ کی دُنیا کو اپنا اسیر کرتے اور اقلیمِ ذہن پر حکمرانی کا جادو جگاتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ایک زمانے تک شاعری اور غزل باہم مترادف کے طور پر مستعمل رہے ہیں۔ غزل بہ ظاہر آسان مگر بہ باطن مشکل اور پیچیدہ صنف ہے۔ فراقؔ گورکھ پوری نے اسی لیے اسے انتہاؤں کا سلسلہ قرار دیا ہے۔ اس صنف نے ہمیشہ اپنے مخصوص مزاج، موضوعات، لفظیات اور ہیئت کی نگہ داری اور پاس داری کی ہے اور مشکل حالات میں بھی اس نے اپنے تشخص کو قائم رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مخالف ہواؤں میں بھی اس کا چراغ روشن رہا۔ اسے وحشی صنف قرار دے کر گردن زدنی ٹھہرایا گیا مگر کوئی اس کا بال بیکا نہ کر سکا۔ یہ پہلے سے زیادہ توانائی کے ساتھ ابھرتی، دلوں کی دھڑکنوں میں بستی اور ہونٹوں پر مچلتی رہی۔ اس کے بارے میں طرح طرح کی غلط فہمیاں پیدا کی جاتی رہیں۔ اس کے دامن کو محدود اور اس کے ظرف کو تنگ ثابت کیا جاتا رہا مگر یہ اپنی فطری بے نیازی کے ساتھ سرگرمِ عمل رہی۔ شمیم احمد رقم طراز ہیں:

> ''دُنیا بھر کی اصنافِ شاعری میں صرف غزل ہی ایک ایسی صنف ہے جو ایک طرف حد سے زیادہ محدود، مقید، پابند، متشدد اور مقررہ اصولوں اور ہیئت کی حامل ہے اور دوسری طرف اتنی ہی وسیع، گہری اور پیچیدہ معنویت کی حامل ہے۔ یہ دونوں چیزیں بہ ظاہر متضاد معلوم ہوتی ہیں مگر ایک دوسرے سے اسی طرح پیوستہ ہیں جس طرح انسان کا ظاہر اور باطن _____ کہ ایک طرف انسان محدود و مخصوص اعضا اور جسمانی خصوصیات رکھتا ہے اور دوسری طرف اس کے محسوسات اور تخیل کی کوئی انتہا نہیں ہے۔'' (۳)

غزل کے بارے میں ایک بدگمانی یہ بھی رہی ہے کہ یہ نادیدہ زمینوں کی حیرت آگیں تصویریں اور خیالی دُنیاؤں کے طلسماتی مناظر پیش کرتی ہے یا ہجر و وصال اور زلف و رخ کی کہانیاں سناتی ہے اور اس کا دامن عصری مسائل اور معاشرتی زندگی کی تصویروں سے خالی ہے۔ یہ بدگمانی غزل کی روایت سے بے خبری اور اس کی شان دار تاریخ سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے۔ غزل کا عہد بہ عہد مطالعہ ثابت کرتا ہے کہ اس نے حالات کے ہر تقاضے اور زمانے کی ہر کروٹ کو محسوس کیا اور اپنے مخصوص مزاج کے مطابق اس کو اپنے دامن میں سمیٹنے کی بھرپور کوشش کی۔ غزل معاشرے کی رنگ بدلتی صورتوں کی محض عکاسی ہی نہیں کرتی بلکہ اس کی تعمیر و تشکیل اور اصلاح و درستی میں برابر شریک رہتی ہے۔ غزل کا شاعر محض اپنی آرزوؤں، ناآسودہ خواہشوں اور کیفیتوں کا اظہار نہیں کرتا بلکہ اس کے اشعار میں پورے کا پورا سماج اپنے تمام تر رنگوں کے ساتھ عکس فگن ہوتا ہے۔ مصرعوں کے دروبست میں معاشرے کا خواب جھلکتا ہے اور شعروں کے بطون سے ان خوابوں کی تعبیر کی تڑپ جھانکتی دکھائی دیتی ہے۔ غزل اگر محض

انفرادی رنگوں کی نقیب ہوتی اور صرف ایک فرد کے احساسات کی ترجمانی کا فریضہ ادا کرتی تو یوں اقلیمِ سخن میں اسے صدیوں کی حکمرانی نصیب نہ ہوتی۔ شمیم احمد لکھتے ہیں:

''غزل انسان کے جن بنیادی احساسات اور خواہشات کو آسودہ کرتی ہے وہ ہزاروں سال سے فرد در فرد، نسل در نسل، گروہ در گروہ، قبیلہ در قبیلہ اور قوم در قوم زمانے کی گردشوں سے بے نیاز یکساں چلی آ رہی ہے۔ غزل انسان کے اسی مشترک سرمایۂ حیات کی وہ نغمہ خواں ہے جس میں آج بھی بہ قول فراقؔ وہی تھرتھراہٹ، نغمگی اور سرمدی فضا ملتی ہے جس کو آفاقی کہا جا سکتا ہے جس پر ایک زمانے، ایک نسل اور ایک مخصوص دور کا ٹھپہ نظر آنے کے باوجود ایک ایسی قوت کا اثر بہت نمایاں ہے جو اسے زمانے کی پابندیوں، خیال کی حدود سے بالا کر دیتی ہے۔ اسی صفت میں غزل کی مقبولیت اور صدیوں تک اس کے اثر و نفوذ کا راز پوشیدہ ہے۔'' (۴)

بیسویں صدی کو ہنگامہ خیز اور انقلاب آفریں صدی قرار دیا جاتا ہے کیوں کہ اس صدی میں انسانی زندگی اور سماج اتھل پتھل اور نوع بہ نوع تبدیلیوں سے دوچار ہوئے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کی روز افزوں ترقی اور انقلاب آفرینی نے جہاں سماج کو آسانیاں اور سہولتیں فراہم کی ہیں وہاں اُن کے جمے جمائے معاشروں کو بیخ و بن سے اکھاڑنے کا فریضہ بھی انجام دیا ہے۔ نیا عہد جہاں امکانات کی بشارت لے کر طلوع ہوا وہاں اس نے ذہنوں کو تشکیک، جذبوں کو سرد مہری اور احساس کو شکستگی کے عذاب میں بھی مبتلا کیا ہے۔ اس صدی میں طرح طرح کے نظریات اور فلسفے عام ہوئے جنھوں نے تصادم اور خانہ جنگی کی صورتِ حال پیدا کر دی اور پوری دُنیا میدانِ جنگ کا نقشہ پیش کرنے لگی۔ اقوام اور ممالک کے باہمی تصادم کے باعث معاشرتی، اخلاقی، سیاسی، روحانی، مذہبی اور تہذیبی اقدار بُری طرح پامال ہوئیں اور عہدِ جدید کا انسان طرح طرح کے فکری اور ذہنی مسائل سے دوچار ہوا۔ اس صورتِ حال میں ادب نے آگے بڑھ کر سماج کی چارہ گری اور افراد کی رہبری کا بیڑا اٹھایا۔ بگڑے اور بپھرے ہوئے حالات سے نبرد آزما ہونے کے لیے ادب نے اپنے دائرے کو کشادہ اور اپنے طریقِ کار کو نئے رنگ و آہنگ سے ہم کنار کیا۔ اظہار و ابلاغ کے نئے پیمانے وجود میں آئے۔ فنی، تکنیکی اور اسالیبی سطح پر متعدد تجربات نے شعر و ادب کو نئے ذائقوں سے مالا مال کر دیا۔ مقصدیت اور افادیت کی معنویت نئے طرزِ احساس میں ڈھلنے لگی۔ ان حالات میں مشرقی ادبیات کی نمائندہ اور سماج میں سب سے مقبول صنفِ سخن غزل بھی متاثر ہوئی اور اس کا دامن بھی وسعت آشنا ہوا۔ مختلف تحریکوں سے وابستہ شعرا نے اوّل اوّل غزل کو محض عشقیہ صنفِ شعر خیال کرتے ہوئے، اپنے تخلیقی کرب کے اظہار کے لیے مناسب نہ سمجھا اور شاعری کے دوسرے پیمانوں میں کلام کر کے اپنے نظریات و خیالات کا پرچار کرتے رہے مگر عوام کے دل جو غزل سے جُڑے ہوئے تھے، ان شعری پیمانوں کی طرف متوجہ نہ ہوئے۔ اس صورتِ حال نے مختلف تحریکوں کے شعرا کو غزل کی حاکمیت تسلیم کرنے پر مجبور کیا۔ وہ شعرا جو کل تک اسے محض ایک عشقیہ صنف خیال کرتے تھے وہ اس میں اپنے سیاسی اور معاشرتی مسائل کو بیان کرنے لگے۔ غزل نے مختلف تحریکوں کے خیالات و افکار کو عام کرنے اور معاشرے میں ان کے منشور کو

پھیلا کر عوام کی تربیت کا فریضہ انجام دیا۔ بیسویں صدی کے نصفِ اوّل کی غزل رنگا رنگ خیالات اور متنوع افکار کا مرقع ہے۔

۱۹۴۷ء میں ہندوستان کی تقسیم کے نتیجے میں ایسے روح فرسا اور قیامت خیز واقعات رونما ہوئے جن کی مثال پوری انسانی تاریخ میں کہیں اور نہیں ملتی۔ ہندو مسلم فسادات کے الاؤ میں ہزاروں افراد اپنی جنم بھومی سے بہ چشمِ نم رخصت ہوئے لیکن راستے ہی میں ہزاروں خاندان لوٹ کھسوٹ اور قتل وغارت گری کا نشانہ بنے۔ ان روح فرسا حالات اور دل دوز واقعات نے ہندو پاکستان کے عوام پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ غزل نے بے چینی اور اضطراب کی اس کیفیت کو اپنے دامن میں سمیٹنے پر ہی اکتفا نہیں کی بلکہ فسادات کے خلاف خلاف شدید ردِعمل کا اظہار کر کے افرادِ معاشرہ کے زخموں پر پھاہا رکھنے کا جتن بھی کیا۔ اس عہد کی غزل جلی ہوئی بستیوں، تباہ شدہ گھروں، اُجڑے چہروں، ناکام آرزوؤں اور بکھرے خوابوں کا نوحہ بن گئی:

بازار بند ، راستے سنسان ، بے چراغ
وہ رات ہے کہ گھر سے نکلتا نہیں کوئی

☆

کاروانوں میں شورِ منزل تھا
آئی منزل تو سب نے ہاتھ ملے

☆

ہر آنسو میں آتش کی آمیزش ہے
دل میں شاید آگ کا دریا بہتا ہے

☆

پاکستان کی تاریخ حادثوں، سانحوں اور المیوں سے بھری ہوئی ہے۔ قدم قدم پر پاکستان کے مکینوں کو اذیت اور دُکھ کے گہرے دریاؤں سے گزرنا پڑا۔ ہجرت اور قیامِ پاکستان کے بعد کے مسائل ابھی تھمے نہیں تھے کہ پاکستانی قوم کو مارشل لا کے عذاب سے گزرنا پڑا۔ ظلم وستم کی رات طویل ہوتی رہی۔ ظلم وستم کی اسی طویل رات میں کہیں پاکستان دولخت ہوا۔ سقوطِ مشرقی پاکستان کے دلدوز سانحے نے خوابوں، خیالوں اور جذبوں کو کچل کر دکھ دیا۔ پاکستان دو بار جنگوں کی ہولنا کیوں سے گزرا۔ ایک مارشل لا کے چنگل سے رہائی ملی تو دوسرے کے خونیں پنجے اُسے جکڑنے کے لیے تیار تھے، دوسرے سے خدا خدا کر کے نجات ملی تو تیسرا اپنے پر پھیلائے کھڑا تھا۔ مارشل لاؤں کی سرپرستی میں ظلم اور بربریت کو کھل کھیلنے کا موقع ملا۔ گھٹن اور جبر کی اس فضا میں جہاں سانس لینا دشوار تھا، تخلیق کار اپنے فرض سے غافل نہیں رہے؛ ادب سماج کے لیے حرفِ تسلی بنا رہا۔ اظہار اور بیان پر پابندیاں لگیں تو رمز وایما کے نئے قرینے جاگے۔ ادب کی باقی اصناف میں بھی اس طویل سیاہ رات کی ہول ناکیوں کو پیش کیا گیا مگر غزل سب سے آگے رہی۔ غزل نے اپنے مزاج کے مطابق معروض کو اپنے خاص علائم میں ڈھال کر پیش کیا۔ پُرانی علامتوں کا معنوی منطقہ وسعت آشنا ہوا؛ نئی علامتیں اور اشارے تخلیق ہوئے جنھوں نے عہدِ موجود کی ہول ناکی کو تمام تر رنگوں

کے ساتھ پیش کر کے لوگوں کو جینے کا حوصلہ بخشا۔غزل نے فقط جبر اور گھٹن کی فضا اور اس کی اذیت کو پیش نہیں کیا بلکہ اس کے خلاف احتجاج اور بغاوت کی آواز بھی بلند کی۔اس کا قالب محض بے گھری اور بے چہرگی کی تصویروں کا نقیب نہیں بلکہ اس عذاب سے نکلنے کی تدبیروں کا مخزن بھی ہے۔ذیل میں جدید اور جدید تر غزل کے چند اشعار پیشِ خدمت ہیں؛ ان اشعار کے آئینے میں پاکستانی سماج کے دُکھ، درد، مسائل، رویے، عادتیں، خواب اور بنتی بگڑتی صورتیں تمام جزئیات کے ساتھ موجود ہیں۔اگرچہ یہ انتخاب کسی خاص التزام سے نہیں کیا گیا، اس کی حیثیت محض مشتِ نمونہ از خروارے کی سی ہے:

کوئی تو شہرِ تذبذب کے ساکنوں سے کہے
نہ ہو یقین تو پھر معجزہ نہ مانگے کوئی

☆

یہ بستی جانی پہچانی بہت ہے
یہاں وعدوں کی ارزانی بہت ہے

☆

کیا رات تھی جب بدلے گئے نام ہمارے
پھر صبح کو خیمے تھے نہ خدام ہمارے

☆

نگاہ میں ہے شکوہ اُس کی عمارتوں کا
وہ معبدوں کا جلال بھولا نہیں ہے مجھ کو

☆

میں سو رہا تھا اور مری خواب گاہ میں
اِک اژدہا چراغ کی لو کو نگل گیا

☆

زمیں سے بہتے لہو کا خراج کُچھ تو ہو
کوئی پکار کوئی احتجاج کُچھ تو ہو

☆

اپنے ملبے سے بھی تعمیر اٹھا لی دل نے
ورنہ دُنیا نے مٹا دینے کو کیا کیا نہ دیا

☆

لوٹا تو خشت خشت تھی مسمار شہر کی
مجھ سے لپٹ کے رو پڑی دیوار شہر کی
کیا پوچھتے ہیں سہمے ہوئے زرد زرد پیڑ
کیا کہہ رہی ہے سرخیِ اخبار شہر کی

☆

اُس جہاں میں خلق کی جاتی ہیں کیسی نعمتیں
اِس جہاں میں تو عجب آسودگی مٹی سے ہے

☆

جیسے کہ اس دیار میں کوئی مکیں نہ ہو
مکڑی نے ہر مکان میں جالا بنا لیا
خون کے داغ سمندر بھی نہیں دھو سکتا
کیا مٹائے گا یہ دھبے سرِ ساحل قاتل

بین کرتی ہوئی خلقت یہ بیاں کرتی ہے
بے گناہوں میں ہوئے جاتے ہیں قاتل شامل

قتل کرتے ہوئے یہ ان کو گماں تک بھی تھا
خون کی دھار سے ہو سکتے ہیں گھائل قاتل

☆

وہ دل وہ داغ جسے یاد ہیں پر اتنا ہے
تری طرح کے تھے اے خاکداں ہمارے شہر

☆

لہو کی موج میں ہم ہیں کہ موج ہم میں ہے
ہم اس سفر میں کہاں ہیں کبھی پتا کریں گے

☆

میں وہ آواز کی صورت ہوں کہ دریا دریا
پوچھتا پھرتا ہوں، میرا بھی کنارہ کوئی ہے

☆

رجائیت غزل کے مزاج میں گندھی ہوئی ہے۔قنوطیت اور یاسیت سے اس کا کُچھ علاقہ نہیں۔اسی جوہر نے اُسے مشکل اور نامساعد حالات میں سہارا دیا ہے اور کٹھن اور دشوار گزار راستوں میں اسے آگے بڑھنے کا حوصلہ بخشا ہے۔غزل معاشرے کے افراد کو بھی اسی جوہر سے آشنا کرنے کا جتن کرتی ہے۔اظہار و بیان کے تمام وسائل غزل کی دسترس میں ہیں، وہ اپنے قاری کے اندر بھی اظہار و بیان کے قرینے بیدار کر کے انھیں معاشرے کا فعال، زندہ اور متحرک کردار بناتی ہے۔

حواشی

(۱) جمیل جالبی، ڈاکٹر: ادب، کلچر اور مسائل؛ کراچی؛ رائل بُک کمپنی؛ ۱۹۸۶ء؛ ص ۳۲۔

(۲) شمس الرحمٰن فاروقی: لفظ و معنی؛ کراچی؛ شہرزاد؛ دوم، ۲۰۰۹ء ص ۱۶۔

(۳) شمیم احمد: ۵=۲+۲؛ مستونگ، کوئٹہ؛ قلات پبلشرز؛ ۱۹۷۷ء؛ ص ۱۴۹۔

(۴) ایضاً: ص ۱۴۴۔

☆☆☆